وفیات

عبداللّطیف اعظمی	۱۰ مئی ۲۰۰۲ء
ڈاکٹر عصمت جاوید	۱۹ اگست ۲۰۰۲ء
ڈاکٹر اکبر رحمانی	۱۷ ستمبر ۲۰۰۲ء
نعیم صدیقی	۲۵ ستمبر ۲۰۰۲ء
ڈاکٹر محمد حمید اللہ	۸ دسمبر ۲۰۰۲ء
ڈاکٹر شہین دُخت مقدم صفیاری	

عبداللّطیف اعظمی

بھارت کے نامور محقق ادیب اور اقبال شناس جناب عبداللطیف اعظمی ۱۰ مئی ۲۰۰۲ء کو دہلی میں انتقال کر گئے.....

اعظمی صاحب متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ سے متعلق موضوعات و شخصیات سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے سرسید، شبلی، مولوی عبدالحق، گاندھی، نہرو، ذاکر حسین، محمد علی جوہر، اور راجندر پرشاد پر چھوٹی بڑی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ علامہ اقبال اور ان کی شخصیت اور افکار سے بھی دلچسپی تھی۔ اقبال صدی کے زمانے میں انھوں نے ''اقبال: دانائے راز'' کے نام سے ایک نہایت عمدہ کتاب تصنیف کی تھی جس پر اتر پردیش اردو اکادمی نے ۱۹۷۹ء میں، اور آل انڈیا میرا کادمی لکھنؤ نے ۱۹۸۵ء میں اعظمی صاحب کو انعامات سے نوازا۔ بعد ازاں انھوں نے رسالہ ''جامعہ'' کا ایک وقیع اقبال نمبر بھی شائع کیا تھا۔ وہ مدتوں اس رسالے کے مدیر رہے۔

اعظمی صاحب یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو بندی کلاں ضلع اعظم گڑھ (یو پی) کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم مدرسۃ الاصلاح، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ میں ہوئی۔ انھوں نے اردو میں ایم اے کیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایم اے عربی کلاس میں داخلہ لیا مگر تکمیل نہ کر سکے۔ پی ایچ ڈی کرنے کا عزم بھی رکھتے تھے مگر گوناگوں مصروفیات کے سبب سے یہ عزم بروئے کار نہ آ سکا۔ راقم کے نام ایک خط (۴ اکتوبر ۱۹۷۸ء) میں بتایا تھا کہ شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین نے ان کے ڈاکٹریٹ کے لیے ''اردو کی خدمات میں جامعہ کا حصہ'' کا عنوان تجویز کیا تھا۔

عبداللطیف اعظمی، مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کے قریبی شاگردوں میں شامل تھے اور مولانا بھی انھیں عزیز رکھتے تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔ وہ ایک کہنہ مشق صحافی بھی تھے۔ رسالہ ''جوہر'' کے علاوہ ہفتہ وار ''نئی روشنی'' اور انجمن ترقی اردو کے رسالے ''صبح'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ وہ رسالوں اور اخباروں میں بکثرت مراسلے لکھا کرتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا کام بہت باریک بینی اور انہماک سے کرتے تھے۔

اعظمی مرحوم ایک سادہ مزاج ملنسار شخص تھے۔ راقم ۱۹۸۶ء میں دہلی گیا تو بڑی محبت سے اپنے گھر لے گئے پھر جامعہ میں کئی لوگوں سے ملوایا۔ آخری روز رات کے وقت دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر

رخصت کرنے کے لیے آئے حالانکہ ان کا گھر وہاں سے بہت دور تھا۔ انھوں نے صبر و قناعت کے ساتھ فقیرانہ اور استغنا کی زندگی گزاری۔ ہر کام کو نہایت توجہ اور دلچسپی سے انجام دینا ان کی افتادِ طبع تھی۔

ان کی تصانیف و تالیفات اور تراجم کی تعداد سترہ ہے۔ وہ آخری زمانے میں مشاہیر علم و ادب کے حالات خصوصاً ولادت و وفات کی تاریخوں اور سنین کی چھان بین میں لگے رہتے تھے اور جزئیات کی تحقیق سے انھیں بہت دلچسپی تھی۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے گوپی چند نارنگ کے اشتراک سے ''ہندستان کے اردو مصنفین اور شعراء'' کے نام سے بھارتی ادیبوں کی ڈائریکٹری مرتب کی تھی (مطبوعہ اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۶ء) جس میں ہزاروں بھارتی ادیبوں، شاعروں اور نام ور اہل قلم کے کوائف حیات فہارس تصانیف وغیرہ شامل ہیں۔

(رفیع الدین ہاشمی)

............☆............

ڈاکٹر عصمت جاوید

اردو زبان و ادب کے معروف محقق، نقاد، ادیب، شاعر، مترجم، ماہر لسانیات اور بزرگ معلم ۱۹ اگست ۲۰۰۲ء کو اورنگ آباد میں وفات پا گئے۔ ان کی زندگی کے آخری ۳۵ سال دکن کے اسی تاریخی شہر میں بسر ہوئے۔

عصمت جاوید ایک اقبال شناس اور کلام اقبال کے ایک ماہر مترجم بھی تھے۔ امراوتی میں قیام (۱۹۵۸-۱۹۶۳ء) کے زمانے میں انھوں نے متعدد انگریزی شعراء کے کلام کا اردو ترجمہ کرنے کے ساتھ ''پیامِ مشرق'' کے ایک حصے ''لالۂ طور'' کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا، جو رسالہ ''دورحیات'' بمبئی میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ عصمت جاوید نے ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' کے منظوم اردو تراجم علی الترتیب ''عکس اسرارِ خودی'' (دہلی ۱۹۹۱ء) اور ''عکس رموزِ بے خودی'' (دہلی ۱۹۹۸ء) کے نام سے شائع کیے۔ اقبال کی فارسی رباعیات کا ترجمہ بھی ''عکس لالہ طور'' کے نام سے دہلی سے چھپ گیا تھا۔ البتہ ''ارمغانِ حجاز'' کے ایک حصے'' بہ حضور رسالت مآبؐ'' کا منظوم اردو ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔

عصمت جاوید ۲ اگست ۱۹۲۳ء کو جونا کوٹ ضلع پونا (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ ان کا پیدایشی نام عصمت اللہ تھا۔ تعلیم بمبئی کے انجمن اسلام ہائی اسکول میں ہوئی۔ سید اسعد گیلانی (جو ایک معروف ادیب اور بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے اور آخری زمانے میں پاکستان کی قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ وفات: ۳/اپریل ۱۹۹۲ء)محسن انصاری، عصمت جاوید کے ہم جماعت بلکہ بہت قریبی اور

گہرے دوستوں میں شامل تھے۔

ان کی ابتدائی ادبی تربیت میں ان کے اردو اور فارسی کے ایک استاد عبدالسمیع نکہت شاہ جہان پوری کا بہت دخل ہے جو فارسی اور اردو زبانوں کے ماہر اور شاعر تھے۔ اسی تربیت کے نتیجے میں عصمت جاوید نے شاعری اور افسانہ نویسی کا آغاز کیا۔

عصمت جاوید کی خوش قسمتی تھی کہ کالج کی تعلیم کے زمانے میں انھیں اسماعیل یوسف کالج بمبئی کے صدر شعبہ اردو و فارسی پروفیسر اشرف ندوی جیسے استاد کی صحبت مل گئی۔ انھوں نے بھی عصمت جاوید کی ادبی تربیت پر خاص توجہ دی۔ بی اے کے بعد عصمت جاوید نے فلمی دنیا میں بھی کچھ وقت گزارا اور علی سردار جعفری کے ساتھ بھی ان کے رسالے ''نیا ادب'' کے منتظم کے طور پر کام کیا لیکن پھر ترقی پسند تحریک سے وابستہ بعض لوگوں کے تضادات فکر و عمل کی وجہ سے ان سے برگشتہ ہو گئے۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ لیکچرر ہو گئے۔ مختلف اوقات میں امراوتی کالج، اسماعیل یوسف کالج بمبئی اور شولا پور کالج میں پڑھاتے رہے۔

۱۹۶۷ء میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج اورنگ آباد ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے کیونکہ بمبئی کو چھوڑ کر اورنگ آباد نہیں جانا چاہتے تھے۔ لیکن جب اورنگ آباد پہنچے تو وہاں کا ماحول اور اس تاریخی شہر کی فضا انھیں اس قدر پسند آئی کہ پھر وہ وہیں کے ہو رہے۔ خیال رہے کہ اورنگ آباد مولانا مودودی کی جائے پیدایش ہے اور اورنگ زیب عالمگیر (ترکش مارا خدنگ آخریں) اورنگ آباد ہی میں آسودۂ خاک ہیں۔ عصمت جاوید کی باقی عمر اسی شہر میں بسر ہوئی۔ انھوں نے اپنی پہلی تصنیف ''فکر پیما'' کو اورنگ آباد کے نام معنون کیا۔ ''دکن کی پرانی دلی اورنگ آباد کے نام، جہاں میرے قلم نے تیز چلنا سیکھا''۔

عصمت جاوید کی شخصیت خاصی ہمہ جہت تھی۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ ڈراما نویسی سے بھی دلچسپی تھی۔ تحقیق و تنقید میں بھی ان کا ایک خاص مقام تھا۔ ''اردو پر فارسی کے لسانی اثرات'' ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع تھا۔ ''لسانی جائزے'' اور ''نئی اردو قواعد'' بھی لسانیات کے موضوع سے بحث کرتی ہیں۔

ترجمہ کرنے میں بھی انھیں خوب مہارت تھی۔ ان کے تراجم کلام اقبال کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے فارسی سے اردو، انگریزی سے اردو، عربی سے اردو اور مرہٹی سے اردو ترجمے کیے۔ ان کے تراجم میں خاص تنوع ہے۔

وہ اردو اور فارسی کے ایک کامیاب معلم تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ انھوں نے متعدد درسی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ وہ مہاراشٹر اردو ٹیکسٹ بک بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ ان کی مرتبہ انٹرمیڈیٹ کے لیے اردو کی کتاب کے بارے میں اس وقت کے بھارتی صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے یہ

رائے دی: ''اتنی جامع اور مکمل اردو کتاب میں نے ملک کے طول وعرض میں اس سے قبل نہیں دیکھی تھی''۔ وہ پی ایچ ڈی کے طلبہ کے نگران (سپروائزر) بھی رہے۔

عصمت جاوید کا علمی و ادبی ذخیرہ خاصا متنوع ہے۔ ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد سترہ ہے۔ لیکن ان کے ایک دوست رشید انصاری کا بیان ہے کہ اس سے دوگنی تعداد میں ان کے مسودے ہنوز تشنۂ طباعت ہیں۔

وہ ایک عمدہ شاعر بھی تھے۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ''اکیلا درخت'' اور نظموں کا مجموعہ ''قفس رنگ'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ بظاہر ان کی شاعرانہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے نہ آ سکیں۔ لیکن فی الحقیقت انھوں نے شعوری طور پر علمی کاموں کو شعر گوئی پر ترجیح دی، ان کا ایک شعر ہے:

جو مجھ پر نثر کا ہوتا نہ قرض اے جاوید
میں شاعری میں بڑا نام کر گیا ہوتا

عصمت جاوید کا قلم تقریباً نصف صدی تک رواں رہا۔ انھوں نے مختلف اصناف نظم و نثر میں قابل قدر ادبی و علمی ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ لیکن ان کی خاطر خواہ قدر اور عزت افزائی نہیں ہوئی نہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ کسی ادبی گروپ سے وابستہ نہ تھے۔

طبعاً وہ درویش منش، وضع دار اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ ان کے قریبی دوستوں کا تاثر ہے کہ عصمت جاوید کی شخصیت، مولانا حالی کی یاد دلاتی تھی۔ آخری عمر میں وہ خودنوشت لکھ رہے تھے جو ناتمام رہی۔ خدا اُن کی مغفرت کرے۔

(رفیع الدین ہاشمی)

............☆............

ڈاکٹر اکبر رحمانی

بھارت کے ممتاز ماہر تعلیم، اردو زبان وادب کے محقق، نقاد اور تعلیمی ماہنامے ''آموزگار'' کے مدیر اکبر رحمانی ۷ استمبر ۲۰۰۲ء کو جل گاؤں، مہاراشٹر میں انتقال کر گئے۔

جلگاؤں کے ایم جے کالج میں درس و تدریس کے ساتھ وہاں سے ''آموزگار'' نکالتے تھے۔ متعدد تعلیمی اور علمی اور صحافتی انجمنوں اور نصابی کمیٹیوں کے رکن تھے۔ ماہنامہ ''آموزگار'' انھوں نے جلگاؤں سے ۱۹۷۴ء میں جاری کیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ تھا۔ جس میں تعلیمی مسائل کے ساتھ ساتھ مختلف درجوں اور مضامین کے نصابات بھی زیر بحث آتے تھے۔ اسی طرح اردو زبان و ادب کے بارے میں حکومتی پالیسیوں کا جائزہ بھی لیا جاتا تھا۔ اس لیے اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ مگر اس کی اشاعت میں بعض وجوہ سے تسلسل نہ رہ سکا۔ لیکن چند سال بعد دوبارہ جاری ہوا اور اکبر رحمانی

نے نامساعد حالات کے باوجود اسے بڑی ہمت اور حوصلے سے اپنی وفات تک جاری رکھا۔

اکبر رحمانی اقبالیات سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اسی حوالے سے راقم کا ان سے تعارف ہوا۔ غالباً یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ وہ عباس علی خان لمعہ پر، خصوصاً ان کے نام اقبال کے خطوں پر تحقیق کر رہے تھے۔ بعد ازاں انھوں نے اسی موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۹ء میں وہ پاکستان آئے اور کراچی سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ یہاں سے انھوں نے علمی کتابوں، بطور خاص اقبالیاتی رسائل و کتب کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا اور جلگاؤں پہنچ کر اپنے رسالے میں ذخیرہ اقبالیات پاکستان کا تعارف کرانا شروع کیا۔ اس ضمن میں ''آموزگار'' کے پانچ اقبال نمبر شائع ہوئے۔ بعد ازاں ان نمبروں کو یکجا کر کے ''آموزگار اقبال'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔

جب وہ پاکستان آئے تو انھوں نے لمعہ کے نام خطوط اقبال کا ایک مجموعہ بزم اقبال لاہور کے اس وقت کے اعزازی سیکرٹری ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو اشاعت کے لیے پیش کیا۔ مجھ سے انھوں نے اس مجموعے پر دیباچہ لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن مذکورہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ اس موضوع پر ان کی تحقیق پر بھوپال کے ماسٹر اختر صاحب نے شدید اعتراض کیے مگر اس مناقشے کے باوجود، رحمانی صاحب بڑے استقلال سے اپنا کام کرتے رہے۔ اس موضوع پر انھوں نے اس کے بعد بھی متعدد مفید مضامین لکھے۔

زندگی کے آخری چار پانچ برسوں میں انھوں نے اتنا تحقیقی و تنقیدی اور علمی کام کیا جو ابتدائی دور کے ۱۰۔۲۰ برسوں میں کبھی نہ کیا ہو گا۔ چونکہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے اور گوشہ نشین تھے۔ اس لیے انھوں نے اس وقت سے خوب فائدہ اٹھایا۔

اکبر رحمانی ایک ہوش مند معلم ہونے کے ساتھ قلم کے دھنی بھی تھے۔ تعلیم و تعلم سے ان کی دلچسپی کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ ''آموزگار'' میں وہ مختلف مضامین کی نصابی کتابوں کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ ضیاءالدین اصلاحی کے بقول: ''فرقہ وارانہ اور تنگ نظر ذہن کے لوگ درسی اور غیر درسی خصوصاً تاریخ اور نصابی کتابوں میں جو زہر بھرتے رہتے تھے یا اردو یا اقلیتوں کے ساتھ جس طرح کی زیادتیاں اور ناانصافیاں ہو رہی تھیں، ان کا تدارک کرنا انھوں نے اپنا فرض بنا لیا تھا''۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کے بقول: ''اکبر رحمانی کی شخصیت ہمہ گیر تھی ادب، صحافت، تاریخ، عمرانیات، انسانیات کہاں کہاں ان کے قدم کے نقوش نہیں۔ وہ مہاراشٹر کے ایک چھوٹے مقام پر تھے مگر روشنی کا مینار بن گئے جس سے ملک کے مختلف حصوں میں لوگ اپنی منزل کا پتا حاصل کرتے رہے۔ تحریک اسلامی سے بھی انھیں خاص تعلق تھا۔ مقامی اور ملک گیر سطح پر ان کے روابط اسکے قائدین سے بے حد پرخلوص اور گہرے تھے۔ اردو زبان اور مسلمانوں کی تعلیم کے فروغ کو انھوں نے اپنی زندگی کا

مشن بنا لیا تھا۔ زندگی نہایت سادہ اور مجاہدانہ تھی۔ اخلاص بے کراں تھا۔ افسوس ہوتا ہے کہ خاک میں کیسی کیسی صورتیں مل جاتی ہیں لیکن ان کی نیکیاں، اخلاص اور کارنامے ان کی یاد تازہ کرتی رہتی ہیں''۔

خدا ان کی مغفرت کرے۔ ان کی وفات ہماری (خصوصاً بھارت کی) علمی اور تعلیمی اور اقبالیاتی دنیا کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

............☆............

نعیم صدیقی

معروف شاعر، ادیب، دینی مصنف اور رسالہ ''سیارہ'' کے بانی مدیر جناب نعیم صدیقی ۲۵ ستمبر ۲۰۰۲ء کو دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

جناب فضل الرحمان نعیم صدیقی کا شمار بزرگ اہل قلم میں ہوتا ہے۔ وہ گوناگوں علمی اور ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے تقریباً ہر صنف ادب میں لکھا۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے افسانے، تمثیلیں اور انشائیے لکھے۔ سیرت نگاری کی اور دینی ادب پر بھی ان سے بہت سی کتابیں یادگار ہیں۔

وہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے بھی غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۶۳ء میں علامہ اقبال پر اپنی پہلی کتاب ''علامہ اقبال اور نظریہ پاکستان'' شائع کی۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً اقبالیات کے مختلف پہلوؤں پر لکھتے رہے۔ ان کے نزدیک علامہ اقبال ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ بیسویں صدی میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے بہت بڑے داعی بھی تھے اور اس حیثیت میں انھوں نے دور حاضر کی اسلامی تحریکوں پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔ جناب نعیم صدیقی اقبال مخالف تحریروں کا تعاقب کرنے میں ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ اقبال پر ان کے مضامین کا ایک وقیع مجموعہ ''اقبال ایک شعلہ نوا'' کے نام سے دو مرتبہ چھپ چکا ہے۔ ان کی شاعری اور نثری تحریروں پر فکر اقبال کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ان کے جاری کردہ ادبی رسالے ''سیارہ'' نے اقبالیات اور فکر اقبال کے فروغ کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں تفصیل کے لیے دیکھیں: پروفیسر جعفر بلوچ صاحب کا مرتبہ مجموعہ ''اقبال شناسی اور سیارہ'' بزم اقبال، لاہور۔

جناب نعیم صدیقی ۴ جون ۱۹۱۶ء کو خان پور ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ منشی فاضل کرنے کے بعد درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے مگر جلد لاہور آ کر ملک نصر اللہ خاں عزیز کے اخبار ''مسلمان'' کے عملہ ادارت میں شامل ہو گئے۔ اس اثنا میں وہ مولانا مودودی کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور ہمہ وقتی طور پر جماعت اسلامی سے وابستہ ہو گئے۔ انھیں دارالاسلام پٹھان کوٹ اور بعدازاں لاہور میں مولانا مودودی کی قربت حاصل رہی۔ مختلف اوقات میں وہ ماہنامہ ''چراغ راہ'' کراچی، ''شہاب'' لاہور،

''ترجمان القرآن'' لاہور اور ''سیارہ'' لاہور کے مدیر رہے۔

نعیم صدیقی کلاسیکی روایت کے شاعر تھے۔ انھوں نے بعض ملی موضوعات اور حادثات (کشمیر، فلسطین، سقوط مشرقی پاکستان، بوسنیا وغیرہ) پر یادگار نظمیں لکھیں۔ ان کے متعدد شعری مجموعے (''شعلہ خیال''، ''بارود اور ایمان''، ''خوں آہنگ''، ''پھر اک کارواں لٹا''، ''نور کی ندیاں رواں'' اور ''وہ سورج بن کے ابھرے گا'') چھپ چکے ہیں۔

سیرت النبیؐ پر ان کی تصنیف ''محسن انسانیت'' اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے۔ مولانا مودودی کی سیرت اور شخصیت پر ''المودودی'' اور علمی و دینی موضوعات پر انھوں نے متعدد کتابیں (تحریکی شعور، معرکہ دین و سیاست، انسان کا معاشی مسئلہ، انوار و آثار، بنیاد پرستی وغیرہ) تصنیف کیں۔ ''ذہنی زلزلے'' اور ''ٹھنڈی آگ'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ مولانا مودودی کی ''سیرت سرور عالمؐ'' کی ترتیب بھی (بہ اشتراک: عبدالوکیل علوی) ان کا ایک اہم تالیفی کام ہے۔ بقول محمود عالم: ''فکر و خیال اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے وہ مولانا مودودی کے مثنیٰ تھے''۔

(رفیع الدین ہاشمی)

.....☆.....

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

عالم اسلام کے ممتاز محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا ۱۸ دسمبر ۲۰۰۲ء کو امریکی ریاست فلوریڈا میں انتقال ہوگیا۔ انّا للّٰہ انّا الیہ راجعون۔ آپ نے ۹۶ برس عمر پائی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی شخصیت علمی حلقوں کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ وہ تحقیق و تخلیق کی اعلیٰ روایات کے مالک ایک عظیم اور افضل انسان تھے۔ انھیں ۹ مختلف زبانوں پر قدرت حاصل تھی جن میں اردو، فارسی، عربی، ترکی، جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں شامل ہیں۔ اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب و تمدن کا مطالعہ ان کا خصوصی شعبہ تھا۔

ڈاکٹر حمید اللہ ۱۹ فروری ۱۹۰۸ء (۱۶ محرم الحرام ۱۳۲۶ھ) دکن کے تاریخی شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق حیدرآباد کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال متوسط خاندان سے تھا۔ آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ کچھ عرصہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھاتے رہے۔ پھر آپ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جرمنی چلے گئے۔ جرمنی میں انھوں نے بون یونیورسٹی سے بین الاقوامی قانون پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے میں ترمیم و اضافہ کے بعد اسے *Muslim Conduct of State* کے نام سے کتاب شائع کرائی۔ ڈاکٹر حمید اللہ جرمنی سے فرانس چلے گئے کیونکہ وہاں کی علمی فضا انھیں زیادہ سازگار محسوس ہوئی۔

فرانس کی سوربون یونیورسٹی میں انھوں نے عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے فرانسیسی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا اور فرانسیسی میں دو جلدوں میں سیرۃ النبیؐ پر کتاب تصنیف کی۔ ڈاکٹر مرحوم نے جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں ۱۲ خطبات دیے جو عہد نبوی اور نظام تشریع و عدلیہ کے نام سے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس امر کی تردید کی کہ امریکی آئین دنیا کا پہلا آئین ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے میثاق مدینہ کو دنیا کا پہلا تحریری آئین قرار دیا۔ انھوں نے یہ بھی تحقیق کی کہ تدوین حدیث کا آغاز صحاحِ ستہ سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا جس کی شہادت ''صحیفہ ہمام ابن منبہ'' ہے۔ اس نایاب کتاب کے دنیا میں صرف دو نسخے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں مرتب کر کے شائع کیا۔ بلکہ ان دونوں کی مدد سے ایک مستند نسخہ تیار کیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا خصوصی موضوع مطالعہ عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ تھا۔ جس کا مقصد اس عہد کے تقابلی مطالعے سے اسلام کی حقانیت اور صداقت ثابت کرنا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی کتابیں دنیا کی بہت سی زبانوں میں شائع ہوئیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ سقوط حیدرآباد کے بعد فرانس میں مقیم ہو گئے۔ تاہم انھوں نے کسی بھی ملک کی شہریت حاصل نہ کی۔ بھارت کی شہریت وہ لینا نہیں چاہتے تھے اور پاکستان میں آئے بھی مگر بوجوہ یہاں قیام نہ کیا۔ انھوں نے دنیا کی ممتاز جامعات میں لیکچر دیے۔ جامعہ استنبول سے بھی وہ دیر تک وابستہ رہے۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ثابت کیا کہ حدیث کی کتابت عہد نبویؐ میں شروع ہو چکی تھی اور خلافت راشدہ کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ انھیں صحیفہ ہمام ابن منبہ کا نسخہ جرمنی کی ایک لائبریری سے ملا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ جو احادیث اس میں ہیں وہ بعد کے مجموعہ ہائے احادیث میں بھی ہیں۔ حدیث کی صحت اور حجیت منوانے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ ایک معتدل مزاج، جدید رجحانات کے مالک ایک عالم دین تھے۔ عہد جدید سے مطابقت میں بھی انھیں اہم مقام حاصل ہے۔ دین اور فقہی امور میں شدت پسند نہ تھے مثلاً رفع یدین کو بھی سنت قرار دیتے تھے اور نہ کرنے کو بھی درست تصور کرتے تھے۔ عورتوں کے رقص کے بھی خلاف نہ تھے بشرطیکہ وہ محرموں کے سامنے ہو۔ اسلام کی عہد جدید سے ہم آہنگی اور توافق کے رجحان کو پسند کرتے تھے بشرطیکہ وہ اسلام کی بنیادی روح کے منافی نہ ہو۔ وہ جہاد کو بھی دفاعی ضرورت قرار دیتے تھے۔ وہ قانون سازی میں علامہ اقبال کے پارلیمان کے حق اجتہاد کے خلاف تھے۔ وہ حکومت کو قانون سازی میں اجارہ داری دینے کے خلاف تھے، وہ اسے حضرت امام ابوحنیفہ کی طرح مسلمانوں کا نجی معاملہ قرار دیتے تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ انھوں نے ایک درویشانہ زندگی بسر کی۔ اپنی ضروریات زندگی سوربورن یونیورسٹی کی پنشن سے پوری کرتے تھے۔ انھیں پاکستان میں ادارہ تحقیقات

اسلامی کے بورڈ کا رکن مقرر کیا گیا مگر انھوں نے اسے جلد خیر باد کہہ دیا کیونکہ وہ اسے بے مصرف تصور کرتے تھے۔ اسی طرح بہاولپور یونیورسٹی میں سیرت چیئر بھی قبول نہ کی۔ ان کے دست حق پرست پر تیس ہزار فرانسیسی مسلمان ہوئے۔ جن میں موریس بوکائی بھی شامل ہیں جس نے ''بائبل' قرآن اور سائنس'' کے نام سے اہم کتاب لکھی۔ آپ نے حلال وحرام کے شبہ کی بنا پر پیرس میں قیام کے دوران تیس برس تک گوشت نہیں کھایا۔ آپ اپنی آمدنی جو انھیں کتابوں کی رائلٹی اور لیکچرز سے حاصل ہوتی تھی، تبلیغ اسلام اور ناداروں کی مدد میں صرف کر دیتے تھے۔ انھوں نے تمام زندگی شادی نہیں کی۔ انھیں فیصل ایوارڈ ملا تو انھوں نے اس کی ساری رقم ادارہ تحقیقات اسلامی کی لائبریری کو دے دی۔ یہ لائبریری ان کے نام سے موسوم ہے۔ پبلشرز جو رائلٹی دیتے وہ ساری ڈاک خانہ جا کر خود مختلف مستحقین کو منی آرڈر کر دیتے۔

ان کی وفات کا المیہ بھی افسوسناک ہے۔ چند برس پہلے وہ بنک گئے۔ جہاں ان کی پنشن کی رقم جمع تھی معلوم ہوا کہ کسی نے ان کے اکاؤنٹ سے ساری رقم نکلوا لی۔ انھوں نے کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا۔ کئی دن بعد جب جمع پونجی بالکل ختم ہو گئی تو فاقے کرنے لگے اور فاقوں سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ انھیں فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا۔ علم و دانش کا یہ آفتاب امریکہ کی سرزمین پر غروب ہوا۔ ان کی زندگی کا یہ واقعہ بھی حیرت انگیز ہے کہ وہ زندگی میں صرف ایک بار کلاس میں تاخیر سے پہنچے۔ اس دن ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ کی تدفین کے بعد وہ کلاس میں چلے گئے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اسلامی سیرت و کردار کا مکمل نمونہ تھا۔ فقر و درویشی ان کا سرمایہ حیات تھا۔ پوری دنیا میں ان کی وفات پر اظہار تعزیت کیا گیا اور ان پر خصوصی مقالات لکھے گئے اور ان کی خدمات جلیلہ کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

(ڈاکٹر وحید عشرت)

ڈاکٹر شہین دخت مقدم صفیاری

ممتاز ماہر اقبالیات اور پاکستان دوست ایرانی سکالر ڈاکٹر شہین دخت مقدم صفیاری گذشتہ دنوں امریکہ میں انتقال کر گئیں۔ آپ کچھ عرصہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔

محترمہ شہین دخت تہران میں ۱۱ فروری ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر کامران مقدم صفیاری ایک ممتاز استاد اور انجینئر ہیں جو ایران کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر شہین دخت نے ترکی اور ایران سے الٰہیات اور تاریخ کے موضوعات پر مقالات رقم کیے۔ اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ نے معلّمی کا سلسلہ پرائمری سکول اور مڈل سکول کی سطح سے شروع کیا کچھ عرصہ ٹیچرز ٹریننگ کالج کے شعبہ تاریخ میں لیکچرر رہیں۔ پھر آفیسرز کالج تہران میں تدریسی فرائض انجام دیتی رہیں۔

ڈاکٹر شہین دخت کو تاریخ ادیان و عرفان سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے تاریخ ایران اور ایران کے ہمسایہ ممالک کی تاریخ کا اختصاری مطالعہ کیا۔ اسی دوران ان کی دلچسپی پاکستان، قائداعظم اور حضرت علامہ محمد اقبال سے ہوئی۔ آپ کی تصانیف و تراجم میں ''تاریخ ایران و کشورہای ہمجوار آن'' (دو جلدیں) ''اصول مبانی تاریخ''، ''خرمدینان''، ''نگاہی بہ پاکستان''، ''جناح (قائداعظم) حماسئہ ای در تاریخ''، ''تاریخ مختصر گسترش اسلام''، ''فرہنگ اردو بہ فارسی'' شامل ہیں۔ ان کے تراجم میں علامہ اقبال کی سوانح ''زندہ رود'' از ڈاکٹر جاوید اقبال کا چار جلدی ترجمہ (''جاویدان اقبال'') پروفیسر محمد منور کی تصانیف: ''غزل فارسی اقبال''، ''میزان اقبال''، ''برہان اقبال'' اور ''ایقان اقبال'' کے تراجم شامل ہیں۔ ''شرق و غرب در کلام اقبال'' اور ''نگاہی بہ اقبال'' آپ کے مقالات کے مجموعے ہیں۔ آپ نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب افکار اقبال کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔

ڈاکٹر شہین دخت مقدم اقبال اکادمی کے مجلّے ''اقبالیات فارسی'' کی سردبیر (ایڈیٹر) بھی رہیں۔ آپ نے پاکستان اور ایران میں قدیمی روابط کو مستحکم تر کرنے میں قابل قدر کوششیں کیں۔ انھیں ایران و پاکستان کا ثقافتی سفیر کہنا بجا ہوگا۔ خدا انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

(ادارہ)